ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1908

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

کورس: اسلامی تحریکات عہد جدید میں (1908) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

Semester: Autumn 2026

Assignment No. 1 (Units 1–5) • Total Marks: 100 • Passing Marks: 50

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

Note: This guide is prepared for study and reference purposes. Students are advised to read the relevant units of the course book, understand the concepts, and then write the assignment in their own words.

نوٹ: یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کریں، مفاہیم کو سمجھیں اور پھر امتحانی مشق اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

سوال نمبر 1: زمان و مکان کی تبدیلی کے باوجود اسلامی تعلیمات کی افادیت پر روشنی ڈالیں۔

تعارف

اسلام محض ایک دور، ایک خطے یا ایک قوم کا مذہب نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے آخری اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ قرآن مجید نے حضور اکرم ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار دیا اور دین کو قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ بنایا۔ تاہم ایک سوال ہر دور میں اٹھتا رہا ہے کہ جو تعلیمات ساتویں صدی عیسوی کے عرب معاشرے میں نازل ہوئیں، وہ آج کے ترقی یافتہ، سائنسی اور گلوبلائزڈ دور میں کس طرح مفید اور قابلِ عمل ہو سکتی ہیں؟ بظاہر زمانہ بہت بدل چکا ہے؛ اونٹ کی جگہ تیز رفتار جہاز آ گئے ہیں، خط و کتابت کی جگہ فوری مواصلات نے لے لی ہے، معیشت سود پر مبنی عالمی نظام میں جکڑی ہے اور انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ مگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی افادیت کسی مخصوص زمان و مکان سے وابستہ نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد فطرتِ انسانی پر ہے اور فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

اس جواب میں ہم اسی حقیقت کا جائزہ لیں گے کہ اسلامی تعلیمات کی بنیادی ساخت کس طرح ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ اسلام نے ثابت اصولوں اور متغیر وسائل کے درمیان جو توازن قائم کیا ہے، اجتہاد کا جو دروازہ کھلا رکھا ہے، اور انسانی فطرت سے جو ہم آہنگی پیدا کی ہے، وہی اس کی دائمی افادیت کا راز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود اسلامی تعلیمات آج بھی دنیا کے کروڑوں انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی رہنمائی کر رہی ہیں اور جدید دور کے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

اسلام کی آفاقیت اور ابدیت

اسلامی تعلیمات کی سب سے پہلی خصوصیت ان کی آفاقیت ہے۔ یہ تعلیمات کسی خاص نسل، زبان یا علاقے کے لیے مخصوص نہیں۔ قرآن مجید کا خطاب بار بار "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ" یعنی "اے انسانو!" کے الفاظ سے ہوتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مخاطب ہر دور اور ہر خطے کا انسان ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد ہر زمانے کے انسان کے بنیادی سوالات کا جواب دیتے ہیں: میں کہاں سے آیا ہوں، میری زندگی کا مقصد کیا ہے اور مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ یہ سوالات آج کے انسان کے بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے چودہ سو سال پہلے کے انسان کے تھے۔ جب تک انسان ان سوالات سے دوچار رہے گا، وحی کی رہنمائی اس کے لیے مفید رہے گی۔

دوسری خصوصیت ابدیت ہے۔ اسلام نے نبوت کے سلسلے کے اختتام کا اعلان کر کے یہ پیغام دیا کہ اب انسانیت کو نئی وحی کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ جو اصول دے دیے گئے ہیں وہ قیامت تک کے حالات کے لیے کافی ہیں۔ شریعت کے بنیادی مقاصد یعنی دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت ہر معاشرے کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ آج کی جدید ریاستیں بھی جب حقوقِ انسانی اور فلاحِ عامہ کی بات کرتی ہیں تو درحقیقت وہ انہی مقاصد کی تائید کر رہی ہوتی ہیں جنہیں اسلام نے صدیوں پہلے واضح کر دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی افادیت وقتی نہیں بلکہ دائمی ہے۔

ثابت اصول اور متغیر وسائل کا توازن

اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں ایک حکیمانہ تقسیم رکھی ہے۔ عبادات اور اخلاقی اصولوں میں ثبات رکھا گیا ہے، جبکہ معاملات اور معاشرتی تنظیم میں انسان کو اجتہاد اور تجربے کی آزادی دی گئی ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے بنیادی ارکان ہر دور میں یکساں رہتے ہیں، لیکن ان کی ادائیگی کے انتظامی وسائل بدلتے رہتے ہیں؛ آج حساب کتاب کے جدید طریقوں سے زکوٰۃ کا حساب لگایا جا سکتا ہے اور حج کے انتظامات جدید سہولتوں سے بہتر ہو گئے ہیں، مگر ارکان اپنی اصل صورت میں باقی ہیں۔ یہی توازن اسلام کو جامد ہونے سے بھی بچاتا ہے اور بے راہ روی سے بھی۔

اس کے برعکس دنیوی معاملات میں شریعت نے تفصیلی قانون کی جگہ بڑے اصول دیے ہیں؛ مثلاً معاملات میں باہمی رضامندی، سود کی حرمت، امانت کی ادائیگی اور کسی کو نقصان نہ پہنچانا۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہر دور کے فقہا اپنے زمانے کے مسائل کا حل نکالتے رہے ہیں۔ بینکاری، بیمہ، تجارت اور بین الاقوامی تعلقات کے جدید مسائل پر آج جو فقہی مجالس اور ادارے کام کر رہے ہیں، وہ اسی اصول پر قائم ہیں۔ یوں اسلامی تعلیمات قدیم بھی نہیں ہوتیں اور اپنی اساس سے جدا بھی نہیں ہوتیں۔ یہ لچک اور ثبات کا امتزاج ہی ہر دور میں ان کی عملی افادیت کو برقرار رکھتا ہے۔

اجتہاد: ہر دور کی رہنمائی کا دروازہ

اسلامی تعلیمات کی دائمی افادیت کا سب سے بڑا ذریعہ اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں ایسے نئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے جن کا صریح حکم موجود نہ ہو۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت اسی طریقے کی تصدیق فرمائی تھی کہ پہلے کتاب اللہ، پھر سنتِ رسول اور پھر اپنی رائے سے اجتہاد کرنا۔ اس اجازت نے امت کے علماء کو ہر دور میں نئے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت عطا کی۔ خلافتِ راشدہ سے لے کر آج تک فقہاء نے سینکڑوں نئے مسائل، جیسے اعضاء کی پیوند کاری، ٹیسٹ ٹیوب بچے، الیکٹرانک تجارت اور مصنوعی ذہانت سے متعلق سوالات، پر اجتہادی غور کر کے رہنمائی فراہم کی ہے۔

اجتہاد کے ساتھ ساتھ اسلام نے "عرف" اور "مصلحت" کو بھی شرعی غور میں شامل کیا ہے۔ رسم و رواج شریعت کے بنیادی اصولوں سے نہ ٹکرائیں، وہ معاشرے میں برقرار رہ سکتے ہیں۔ اسی لیے اسلام جس خطے میں بھی گیا، وہاں کی مقامی ثقافت کے اچھے عناصر اس میں سما گئے؛ برصغیر، انڈونیشیا اور افریقہ کے مسلم معاشروں کی تہذیبی رنگا رنگی اسی اصول کا ثبوت ہے۔ زمان و مکان کی تبدیلی اسلام کے لیے مسئلہ نہیں بنتی، کیونکہ اجتہاد، قیاس اور مصلحت کے اصول ہر نئے مسئلے کو دائرۂ شریعت میں پرکھنے کی گنجائش فراہم کرتے ہیں۔ اس دروازے کے کھلے رہنے تک اسلامی تعلیمات کی افادیت برقرار رہے گی۔

انسانی فطرت سے مکمل مطابقت

اسلام نے خود کو "دینِ فطرت" قرار دیا ہے۔ اس کی تعلیمات انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں، اور فطرت نہ زمانے سے بدلتی ہے نہ جگہ سے۔ انسان آج بھی محبت، انصاف، تحفظ، عزتِ نفس اور روحانی سکون کا طلبگار ہے، جیسا کہ وہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے اس کی بیرونی دنیا بدل دی ہے مگر اس کی اندرونی کیفیات وہی ہیں: خوف اور امید، خوشی اور غم، محبت اور رقابت آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات یعنی سچائی، امانت، عدل، احسان، صبر اور شکر انہی فطری کیفیات کی درست سمت متعین کرتی ہیں، اس لیے یہ ہر دور میں یکساں مؤثر ہیں۔

جدید دور کے مسائل اس حقیقت کو مزید ثابت کرتے ہیں۔ مادی ترقی کے باوجود ذہنی دباؤ، اضطراب، خاندانی انتشار، نشے کی وبا اور خودکشی کے بڑھتے رجحانات اس بات کا ثبوت ہیں کہ انسان کی اصل ضرورت روحانی اور اخلاقی رہنمائی ہے۔ اسلام عبادت کے ذریعے اللہ سے تعلق، ذکر کے ذریعے اطمینانِ قلب اور خاندانی نظام کے ذریعے نفسیاتی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ مادیت پرست نظام زندگی کے ان پہلوؤں کا کوئی متبادل پیش نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی معاشروں میں بھی لوگ اسلام کی روحانی تعلیمات کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ فطرت سے یہی ہم آہنگی اسلامی تعلیمات کو ہر زمان و مکان میں مفید بناتی ہے۔

معاشرتی و معاشی تعلیمات کی عصری افادیت

اجتماعی زندگی میں بھی اسلامی تعلیمات کی افادیت نمایاں ہے۔ اسلام نے عدل و انصاف کو معاشرے کی بنیاد قرار دیا، نسل، رنگ اور زبان کی بنیاد پر امتیاز کو ختم کیا اور انسانی مساوات کا ایسا تصور دیا جس تک دنیا بہت بعد میں پہنچی۔ زکوٰۃ، صدقات اور وقف کے نظام کے ذریعے دولت کی گردش اور ارتکاز کے خاتمے کا عملی ڈھانچہ فراہم کیا گیا۔ آج جب دنیا دولت کے ارتکاز اور طبقاتی کشمکش کا شکار ہے، اسلامی معاشی اصول خصوصاً سود کی ممانعت اور دولت کی منصفانہ تقسیم نئے سرے سے توجہ کا مرکز بن رہے ہیں، اور کئی ممالک میں اسلامی بینکاری ایک کامیاب متبادل کے طور پر پروان چڑھ رہی ہے۔

اسی طرح خاندانی نظام، عورت کے حقوق، والدین کی خدمت، پڑوسی کے حقوق اور یتیم کی کفالت جیسی تعلیمات ہر معاشرے کی بقا کی ضمانت ہیں۔ مغرب میں خاندانی ادارے کے زوال نے جو سماجی مسائل پیدا کیے ہیں، ان کے پیشِ نظر مفکرین خود خاندان کی بحالی کی بات کرنے لگے ہیں، جو اسلام کا دیرینہ موقف ہے۔ ماحولیات کے باب میں بھی اسلام نے کفایت شعاری، صفائی، درخت لگانے اور حیوانات کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی، جو آج کے ماحولیاتی بحران میں پوری طرح متعلقہ ہے۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی افادیت کسی ماضی کی داستان نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی ضرورت ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ زمان و مکان کی تبدیلی اسلامی تعلیمات کی افادیت کو ختم نہیں کرتی، کیونکہ یہ تعلیمات کسی عارضی صورتِ حال کے جواب میں نہیں بنیں بلکہ انسانی فطرت، عقل اور وحی کے امتزاج سے تشکیل پائی ہیں۔ ثابت اصولوں اور متغیر وسائل کا توازن، اجتہاد کا کھلا دروازہ، عرف و مصلحت کی گنجائش اور شریعت کے مقاصد کی ہمہ گیری ایسی خصوصیات ہیں جو اسلام کو ہر دور میں زندہ اور قابلِ عمل رکھتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام عرب کے صحراؤں سے نکل کر فارس، برصغیر، جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ تک پھیلا اور ہر خطے کی تہذیب سے ہم آہنگ ہو کر اس نے عدل، علم اور اخلاق پر مبنی معاشرے قائم کیے۔ آج کا انسان جدید مسائل کے حل کے لیے جن اصولوں کی تلاش میں ہے، ان کا متوازن مجموعہ اسے اسلامی تعلیمات ہی میں میسر آ سکتا ہے، بشرطیکہ امت ان تعلیمات کو جامد احکام کے بجائے زندہ رہنمائی کے طور پر سمجھے اور اجتہاد کے ذریعے اپنے دور کے سوالات کا جواب پیش کرے۔

سوال نمبر 2 (20 نمبر)

سوال نمبر 2: حسن البنا کی دعوت کو عوامی تحریک بننے میں کن عوامل نے فیصلہ کن کردار ادا کیا؟

تعارف

امام حسن البنا شہید (1906ء–1949ء) بیسویں صدی کی اسلامی تحریکوں کے بانیوں میں سب سے نمایاں شخصیت ہیں۔ انہوں نے 1928ء میں مصر کے شہر اسماعیلیہ میں اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی۔ آغاز میں یہ چند افراد کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی، مگر چند ہی برسوں میں یہ مصر کی سب سے بڑی عوامی تحریک بن گئی اور اس کی شاخیں پورے عالمِ عرب اور اس سے آگے تک پھیل گئیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے ایک استاد کی دعوت کو لاکھوں انسانوں کی منظم تحریک میں بدل دیا؟ کسی بھی تحریک کی کامیابی محض نعروں سے نہیں ہوتی؛ اس کے پیچھے قیادت کی شخصیت، پروگرام کی جامعیت، تنظیم کی مضبوطی اور عوامی رابطے کے مؤثر ذرائع کارفرما ہوتے ہیں۔

اس جواب میں ہم ان عوامل کا تفصیلی جائزہ لیں گے جنہوں نے حسن البنا کی دعوت کو عوامی تحریک بنانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ ان میں مصر کے اس وقت کے سیاسی و سماجی حالات، خود حسن البنا کی غیر معمولی شخصیت، اسلام کا جامع تصور، تنظیم و تربیت کا مرحلہ وار نظام، فلاحی خدمات، ذرائع ابلاغ کا استعمال اور جبر کے باوجود استقامت شامل ہیں۔ ان عوامل کا مطالعہ آج کی اسلامی تحریکوں کے لیے بھی مشعلِ راہ ہے، کیونکہ دعوت کی کامیابی کے اصول ہر دور میں بنیادی طور پر یکساں رہتے ہیں۔

پس منظر: مصر کے حالات اور خلا

حسن البنا کی دعوت کی کامیابی کا پہلا عامل وہ فکری اور سیاسی خلا تھا جو اس دور کے مصر میں موجود تھا۔ 1924ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے نے عالمِ اسلام کو گہرے صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ مصر برطانوی تسلط میں تھا، معاشرے میں مغربی تہذیب کی یلغار جاری تھی، صہیونی منصوبے کے تحت فلسطین میں یہودی آبادکاری ہو رہی تھی اور سیاسی جماعتیں اقتدار کی کشمکش میں مصروف تھیں۔ روایتی مذہبی قیادت عوامی مسائل سے کٹی ہوئی تھی اور ایک بڑا طبقہ دین کو محض انفرادی عبادات تک محدود سمجھ بیٹھا تھا۔ عام مسلمان اپنے دین اور شناخت کے بارے میں اضطراب کا شکار تھا اور کسی ایسی قیادت کا منتظر تھا جو اسے پر اعتماد راستہ دکھا سکے۔

حسن البنا نے اس خلا کو درست طور پر پہچانا۔ انہوں نے تشخیص کیا کہ مسلمانوں کی پسماندگی کی جڑ دین سے دوری، باہمی انتشار اور مغرب کی ذہنی غلامی ہے۔ ان کی دعوت اسی تشخیص کا جواب تھی، اس لیے عوام کو یہ اپنے دلوں کی آواز محسوس ہوئی۔ تحریک اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب وہ عوام کے محسوس کیے گئے مسئلے کا حل پیش کرے۔ اس کے علاوہ اسماعیلیہ جیسے شہر میں غیر ملکی کمپنیوں کے ملازمین اور مزدوروں کی محرومیاں انہیں روز نظر آتی تھیں، جنہوں نے ان کے اندر عملی اصلاح کا جذبہ پیدا کیا۔ یوں ماحول کی تیاری اور قیادت کی بروقت آمد نے دعوت کی کامیابی کی پہلی بنیاد فراہم کی۔

حسن البنا کی شخصیت اور اسلوبِ دعوت

دوسرا بڑا عامل خود حسن البنا کی شخصیت تھی۔ وہ غیر معمولی ذہانت، بے مثال حافظے، فصاحت و بلاغت اور کردار کی پاکیزگی کے مالک تھے۔ ایک سرکاری اسکول کے استاد ہونے کے ناتے وہ عام آدمی کی زبان اور نفسیات کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کا اسلوبِ دعوت سخت اور جھگڑالو نہیں تھا بلکہ نرمی، محبت اور حکمت پر مبنی تھا۔ وہ چائے خانوں اور قہوہ خانوں

میں جا کر عام لوگوں سے گھل مل جاتے، مزدوروں، طلبہ اور تاجروں سب کو ان کی سطح پر آ کر خطاب کرتے۔ انہوں نے مسلکی اختلافات اور فروعی بحثوں سے ہمیشہ اجتناب کیا، جس سے ہر مکتبِ فکر کے لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔

ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو عمل کی سچائی تھی۔ وہ جو کہتے تھے پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے؛ سادگی، وقت کی پابندی، عبادت کا اہتمام اور لوگوں کی خدمت ان کی عملی زندگی کا حصہ تھی۔ انہوں نے مصر کے دور دراز علاقوں کے طویل دورے کیے، دیہاتوں میں جا کر لوگوں سے ملے اور ہزاروں افراد سے ذاتی تعلق قائم کیا۔ قیادت جب عوام کے درمیان رہتی ہے اور دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہے تو اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ یہی اعتماد [illegible] طاقت بنا۔ ان کی شہادت کے بعد بھی تحریک کا باقی رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے افراد نہیں، ایک نظام تیار کیا تھا، لیکن اس نظام کی روحِ رواں ان کی شخصیت ہی تھی۔

جامع پروگرام: اسلام بحیثیت مکمل نظامِ زندگی

تیسرا فیصلہ کن عامل دعوت کا جامع تصور تھا۔ حسن البنا نے اسلام کو محض نماز روزے کا مذہب قرار دینے کے بجائے اسے زندگی کے تمام شعبوں پر محیط نظام پیش کیا۔ ان کا مشہور موقف تھا کہ اسلام عقیدہ بھی ہے اور عبادت بھی، وطن بھی ہے اور قومیت بھی، دین بھی ہے اور ریاست بھی، روحانیت بھی ہے اور عمل بھی۔ اس جامعیت نے پڑھے لکھے طبقے کو خاص طور پر متاثر کیا، جو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اسلام جدید دور کے سیاسی، معاشی اور سماجی سوالات کا جواب نہیں رکھتا۔ حسن البنا نے قرآن و سنت کی طرف رجوع کی دعوت کو ایک فکری پروگرام کی صورت دی، جس میں تعلیم، معیشت، صحت، سماجی انصاف اور سیاسی آزادی سب شامل تھے۔

انہوں نے تحریک کے اہداف کو مرحلہ وار ترتیب دیا: فرد کی اصلاح، مسلم خاندان کی تشکیل، مسلم معاشرے کی تعمیر اور پھر اسلامی حکومت و عالمی اتحاد کی طرف پیش قدمی۔ یہ ترتیب فطرت کے عین مطابق تھی، کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے بنتا ہے۔ رسائل میں انہوں نے اصولِ دعوت کو بیس نکات میں سمیٹ کر عام فہم بنا دیا، جس سے ہر کارکن کو اپنا راستہ واضح نظر آنے لگا۔ دعوت کی یہ جامعیت اور وضاحت اسے کسی ایک طبقے کی تحریک بننے سے بچا کر پوری قوم کی تحریک بنا گئی، یہاں تک کہ طلبہ، اساتذہ، مزدور، تاجر، کسان اور فوجی افسر سب اس میں شامل ہونے لگے۔

تنظیم، تربیت اور مرحلہ وار حکمتِ عملی

چوتھا عامل مضبوط تنظیم اور مسلسل تربیت کا نظام تھا۔ حسن البنا محض مبلغ نہیں تھے بلکہ ایک باصلاحیت منتظم بھی تھے۔ انہوں نے اخوان کو شعبوں اور خاندانوں (اُسر) کی صورت میں منظم کیا، جہاں پانچ سے دس افراد کا گروہ باقاعدہ ملاقات، مطالعہ، ذکر اور باہمی احتساب کرتا تھا۔ اس چھوٹی اکائی نے کارکن کو تنہائی سے نکال کر ایک زندہ ماحول دے دیا، جس میں اس کی اخلاقی اور فکری تربیت ہوتی رہی۔ مرکزی ہدایات، قاعدہ اجتماعات، تربیتی کیمپ اور دورے تنظیم کو ایک جسم کی طرح جوڑے رکھتے تھے۔ یہی تنظیمی ڈھانچہ تھا جس نے جبر کے ادوار میں بھی تحریک کو بکھرنے نہیں دیا۔

تربیت کے ساتھ حکمتِ عملی کی مرحلہ واریت بھی اہم تھی۔ حسن البنا نے تین مراحل بیان کیے: تعارف اور تبلیغ کا مرحلہ، تنظیم اور تربیت کا مرحلہ اور پھر عمل کا مرحلہ۔ وہ جذباتیت اور جلد بازی کے سخت خلاف تھے اور کہا کرتے تھے کہ تحریکیں شور سے نہیں، خاموش اور مسلسل محنت سے بنتی ہیں۔ انہوں نے حکومت سے غیر ضروری تصادم سے گریز کیا، آئینی ذرائع سے اپنا موقف پیش کیا اور ہر فورم کو دعوت کے لیے استعمال کیا۔ اس تدریجی روش نے تحریک کو وہ وقت دے دیا جس میں وہ جڑیں پکڑ سکی اور جب پابندی اور گرفتاریوں کا دور آیا تو تنظیم عوام کے اندر اس قدر سرایت کر چکی تھی کہ اسے ختم کرنا ممکن نہ رہا۔

فلاحی خدمات، ذرائع ابلاغ اور عوامی رابطہ

پانچواں عامل عملی فلاحی خدمات اور جدید ذرائع کا بھرپور استعمال تھا۔ حسن البنا کا عقیدہ تھا کہ دعوت صرف تقریر سے نہیں، خدمت سے دلوں میں اترتی ہے۔ اخوان نے اسکول، اسپتال، ڈسپنسریاں، کارخانے، سلائی مراکز اور امدادی کمیٹیاں قائم کیں۔ غریب طلبہ کی مدد، مریضوں کا مفت علاج اور مصیبت زدوں کی اعانت عوام کے دل جیتنے کا ذریعہ بنی۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ جماعت ان کے دکھ درد میں کام آتی ہے تو اس کی دعوت ان کے لیے قابلِ اعتبار ہو گئی۔ یہی عملی کردار کسی تحریک کو کاغذی تنظیم سے عوامی تحریک میں بدلتا ہے۔

Page 10 of 24 - AIOU LIBRARY (100% Quality Academic Reference) WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ذرائع ابلاغ کے استعمال میں بھی وہ اپنے وقت سے آگے تھے۔ انہوں نے اخبارات و رسائل جاری کیے، جن میں "الاخوان المسلمون" اور "النذیر" وغیرہ شامل ہیں۔ دروس، خطبات، کانفرنسوں، اسکاؤٹ دستوں اور نوجوانوں کی کھیلوں کی سرگرمیوں نے نئی نسل کو تحریک سے جوڑا۔ خواتین کے لیے الگ شعبہ "اخوات" قائم کیا گیا، جس نے گھروں کے اندر تک دعوت پہنچا دی۔ طلبہ تنظیموں کے ذریعے یونیورسٹیاں تحریک کے مراکز بن گئیں۔ فلسطین کے مسئلے پر آواز اٹھانے اور 1948ء کی جنگ میں رضاکار بھیجنے سے تحریک کو قومی مقصد سے جوڑ دیا گیا، جس نے اس کی مقبولیت کو دوچند کر دیا۔ یوں خدمت، ابلاغ اور قومی مسائل سے وابستگی کے امتزاج نے اخوان کو محض ایک جماعت نہیں بلکہ عوام کی امید بنا دیا۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ حسن البنا کی دعوت کسی ایک سبب سے نہیں بلکہ کئی عوامل کے اجتماع سے عوامی تحریک بنی۔ فکری خاکے نے مواد فراہم کیا، بانی کی پرکشش اور مخلص شخصیت نے اعتماد پیدا کیا، جامع پروگرام نے ہر طبقے کو پتہ دیا، تنظیم و تربیت نے کارکن تیار کیے، فلاحی خدمت نے دل جیتے اور ذرائع ابلاغ و مرحلہ وار حکمتِ عملی نے اس پیغام کو گھر گھر پہنچا دیا۔ یہ عوامل دراصل ہر کامیاب دعوتی تحریک کے بنیادی اجزاء ہیں۔ حسن البنا کی اصل کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے دعوت کو انفرادی وعظ سے نکال کر ایک منظم، تربیت یافتہ اور خدمت گزار اجتماعیت میں ڈھال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہادت اور بار بار کی پابندیوں کے باوجود ان کی فکر دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے لیے تاحال نمونہ سمجھی جاتی ہے اور دعوتِ دین کی تاریخ میں ان کا باب سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔

سوال نمبر 3 (20 نمبر)

سوال نمبر 3: خلافت عثمانیہ کے خاتمے میں مغربی استعمار اور قومیت کے نظریے کے کردار کا تجزیہ کریں۔

تعارف

خلافتِ عثمانیہ تقریباً چھ صدیوں تک عالمِ اسلام کی سیاسی وحدت اور مرکزیت کی علامت رہی۔ 1517ء میں سلطان سلیم اول کے دور سے عثمانی سلاطین نے خلافت کا منصب سنبھالا اور حرمین شریفین کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔ یہ خلافت چاہے اپنے آخری دور میں کمزور ہو چکی تھی، مگر اس کی موجودگی دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک روحانی اور سیاسی مرکز سے جوڑے رکھتی تھی۔ 3 مارچ 1924ء کو ترک قومی اسمبلی کے فیصلے سے اس ادارے کا خاتمہ کر دیا گیا اور آخری خلیفہ عبدالمجید ثانی کو ملک بدر کر دیا گیا۔ اس واقعے کو عالمِ اسلام کی جدید تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ قرار دیا جاتا ہے، جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس خاتمے میں مغربی استعمار اور قومیت کے نظریے نے کیا کردار ادا کیا؟ ظاہر ہے کہ خلافت کا خاتمہ کسی ایک سبب کا نتیجہ نہیں تھا؛ اس میں عثمانی سلطنت کی اندرونی کمزوریاں بھی شامل تھیں۔ لیکن اس تجزیے میں ہم خاص طور پر دو بیرونی و فکری عوامل پر توجہ دیں گے: ایک طرف یورپی استعماری طاقتوں کی صدیوں پر محیط سازشیں اور فوجی مداخلتیں، اور دوسری طرف وہ قوم پرستانہ فکر جس نے مسلم عوام کو امت کے تصور سے کاٹ کر نسل، زبان اور خطے کی بنیاد پر تقسیم کر دیا۔ انہی دونوں عوامل کے ملنے سے وہ فضا بنی جس میں خلافت کا خاتمہ ممکن ہو سکا۔

استعماری طاقتوں کی حکمتِ عملی: تفرقہ اور تسلط

مغربی استعمار کے لیے خلافتِ عثمانیہ ہمیشہ کانٹا تھی، کیونکہ جب تک مسلمانوں کا کوئی مرکزی ادارہ موجود تھا، استعمار انہیں مکمل طور پر اپنا غلام نہیں بنا سکتا تھا۔ انیسویں صدی میں عثمانی سلطنت کو "یورپ کا مردِ بیمار" کہہ کر اس کے علاقوں پر قبضے کا سلسلہ شروع ہوا: فرانس نے الجزائر اور تیونس پر، برطانیہ نے مصر پر قبضہ کیا اور روس بلقان اور قفقاز کی طرف بڑھنے لگا۔ یورپی طاقتوں نے سلطنت کے اندر عیسائی اقلیتوں کی حمایت کے بہانے مداخلت کی، قرضوں کے جال میں پھنسا کر معیشت کو مفلوج کیا اور ایسے معاہدے مسلط کیے جن سے سلطنت کی خود مختاری ختم ہوتی گئی۔ سیاسی طور پر یہ پالیسی "مشرقی مسئلہ" کے نام سے جانی جاتی ہے، جس کا مقصد عثمانی علاقوں کی تقسیم تھا۔

پہلی جنگِ عظیم میں یہ حکمتِ عملی اپنے عروج پر پہنچی۔ 1916ء کے سائیکس پیکو خفیہ معاہدے میں برطانیہ اور فرانس نے مشرقِ وسطیٰ کو آپس میں بانٹنے کا منصوبہ بنایا، 1917ء کے اعلانِ بالفور میں فلسطین میں یہودی وطن کا وعدہ کیا گیا اور مکہ کے شریف حسین کو خلافت و عرب بادشاہت کے خواب دکھا کر عثمانیوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا گیا، جس میں برطانوی افسر لارنس نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جنگ کے بعد معاہدۂ سیورے (1920ء) نے اناطولیہ تک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اگرچہ مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ترکوں نے یونانی جارحیت ناکام بنا کر معاہدۂ لوزان (1923ء) میں اپنے وطن کی آزادی حاصل کر لی، مگر استعمار اپنا اصل مقصد پا چکا تھا: عرب علاقے اس کے قبضے میں تھے، فلسطین صہیونیت کے لیے تیار تھا اور خلافت کا ادارہ اب محض ایک ایسی لاش رہ گیا تھا جسے دفن کرنا باقی تھا۔

قومیت کا نظریہ: امت کی تقسیم کا فکری ہتھیار

استعمار کی فوجی کامیابی سے زیادہ خطرناک اس کا فکری ہتھیار قومیت کا نظریہ تھا۔ یورپ میں پروان چڑھا یہ تصور کہ ہر نسل، زبان یا خطے کے لوگ الگ قوم ہیں اور ان کا الگ وطن و ریاست ہونی چاہیے، جب مسلم دنیا میں داخل ہوا تو اس نے امتِ واحدہ کے اسلامی تصور کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ یہ نظریہ استعماری تعلیمی اداروں، مستشرقین کی تحریروں اور مقامی مغرب زدہ دانشوروں کے ذریعے پھیلا۔ پہلے بلقان کی عیسائی قوموں نے اسی نظریے کی بنیاد پر بغاوتیں کیں، پھر یہی تصور عرب اور ترک مسلمانوں کے ذہنوں میں داخل کیا گیا کہ ان کی اصل شناخت دین نہیں، نسل اور زبان ہے۔

ترکوں میں "نوجوان ترک" اور انجمنِ اتحاد و ترقی نے ترکی قومیت کو پروان چڑھایا؛ ترک زبان کو عربی رسم الخط سے الگ کرنا اور دیگر اقوام پر ترکی ثقافت مسلط کرنا اسی فکر کا نتیجہ تھا، جس سے عربوں میں ردعمل کے طور پر عرب قومیت ابھری۔ عرب دانشوروں اور شریفِ مکہ جیسے رہنماؤں نے استعمار کے اشارے پر "عرب خلافت" کے نعرے کو اپنایا اور عثمانیوں کے خلاف بغاوت کو قومی آزادی کا نام دیا۔ یوں ایک ہی امت کے دو بڑے عناصر ترک اور عرب ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ قومیت نے وہ کام کر دکھایا جو استعمار کی فوجیں نہ کر سکیں: مسلمانوں نے اپنے ہی مرکزِ خلافت کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور پھر اس کے خاتمے پر اعتراض کے بجائے اپنے اپنے قومی بیانیے کو ترجیح دی۔

Page 13 of 24 - AIOU LIBRARY (100% Quality Academic Reference) WhatsApp Orders: +92 324 5836626

1924ء کا خاتمہ اور اس کے اثرات

ان حالات میں جب مصطفیٰ کمال نے ترکی جمہوریہ قائم کی تو اس کے لیے خلافت ایک ایسی قوت تھی جو قومی ریاست کے تصور سے ٹکراتی تھی اور جس کی وفاداری ریاست کی سرحدوں سے باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ قوم پرستانہ قیادت کی نگاہ میں خلافت پسماندگی اور مذہبی رجعت پسندی کی علامت تھی، اور استعماری طاقتوں کے لیے اس کا خاتمہ ان کے طویل منصوبے کی تکمیل تھا۔ چنانچہ مارچ 1924ء میں قومی اسمبلی نے خلافت کے خاتمے کا قانون منظور کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مغربی طاقتوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ خلافت کے بعد مسلم دنیا کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکے گی۔ اس کے برعکس برصغیر کے مسلمانوں نے خلافت تحریک کے ذریعے اس ادارے کی آخری سانسوں تک حفاظت کی کوشش کی، مگر مرکز میں فیصلہ ہو چکا تھا۔

خاتمۂ خلافت کے اثرات دور رس نکلے۔ مسلم دنیا درجنوں قومی ریاستوں میں بٹ گئی، جن کی سرحدیں استعمار نے کھینچی تھیں اور جن کے باہمی تنازعات آج تک ختم نہیں ہوئے۔ فلسطین کا مسئلہ، کشمیر کا تنازع اور مسلمانوں کی عالمی سطح پر سیاسی بے بسی اسی مرکزیت سے محرومی کا نتیجہ ہیں۔ فکری سطح پر مسلمانوں میں یہ بحث شروع ہوئی کہ اسلام اور ریاست کا تعلق کیا ہے، اور یہی بحث بیسویں صدی کی اسلامی تحریکوں کی بنیاد بنی؛ اخوان المسلمون اور جماعتِ اسلامی جیسی تحریکوں کا قیام دراصل اسی خلا کا ردعمل تھا۔ اس طرح خلافت کے خاتمے نے اگرچہ ایک ادارے کو ختم کیا، مگر امت میں اپنی وحدت کی بازیابی کی تڑپ پیدا کر دی جو آج بھی زندہ ہے۔

تنقیدی جائزہ

منصفانہ تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ساری ذمہ داری استعمار اور قومیت پر ڈالنا بھی درست نہیں۔ عثمانی سلطنت اندرونی طور پر انتظامی بدعنوانی، فوجی پسماندگی، سائنسی ترقی سے بے خبری اور جانشینی کے تنازعات کا شکار تھی۔ بعد کے سلاطین کی کمزوری اور علماء و ریاست کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج نے بھی زوال کو تیز کیا۔ اگر سلطنت اندر سے مضبوط ہوتی تو بیرونی سازشیں کامیاب نہ ہوتیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اندرونی کمزوریاں اکثر سلطنتوں میں ہوتی ہیں اور اصلاح سے دور ہو جاتی ہیں، مگر خلافت کے معاملے میں فیصلہ کن

ضرب باہر سے لگی: استعمار نے زوال پذیر سلطنت کو سنبھلنے کا موقع دینے کے بجائے اس کے ٹکڑے کرنے کی منصوبہ بندی کی، اور قومیت کے نظریے نے وہ فکری بنیاد فراہم کی جس سے مسلمان خود اس تقسیم کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اس ساری صورتِ حال کا سبق آج کے لیے واضح ہے۔ امت کی طاقت اس کی وحدت میں ہے اور اس وحدت کو سب سے زیادہ نقصان باہری ہتھیار سے کم اور اندرونی فکری تقسیم سے زیادہ پہنچتا ہے۔ قومیت، لسانیت اور فرقہ واریت کے وہی پرانے ہتھیار آج بھی استعمال ہو رہے ہیں، جبکہ میڈیا اور نظریاتی یلغار نے استعمار کی کلاسیکی صورت بدل دی ہے۔ خلافت کے خاتمے کی تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ سیاسی ادارے اسی وقت بچتے ہیں جب ان کے پیچھے زندہ فکر اور متحد عوام موجود ہوں۔ یہی تاریخی شعور اسلامی تحریکوں کی فکری تربیت کا بنیادی جزو ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ مغربی استعمار کی صدیوں کی سازشوں اور قومیت کے نظریے کے ملے جلے عمل کا نتیجہ تھا۔ استعمار نے فوجی، معاشی اور سفارتی دباؤ سے سلطنت کو اس قدر کمزور کیا کہ وہ اپنے وجود کا دفاع نہ کر سکی، اور قومیت نے ترکوں اور عربوں کو امت کے اجتماعی شعور سے کاٹ کر اس خاتمے کو اخلاقی اور فکری جواز فراہم کیا۔ 1924ء میں ادارہ ختم ہو گیا مگر اس کا خلا آج تک پر نہیں ہو سکا؛ مسلم دنیا کی تقسیم، فلسطین سمیت اس کے حل طلب مسائل اور وحدت کی مسلسل تلاش اسی سانحے کی بازگشت ہے۔ اس تاریخ کا مطالعہ ہر طالب علم کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ وہ جان سکے کہ قومیں جنگوں سے کم اور اپنی فکری اساس کھو دینے سے زیادہ ہارتی ہیں، اور اپنی اساس کی حفاظت ہی ان کی بقا کی ضمانت ہے۔

سوال نمبر 4 (20 نمبر)

سوال نمبر 4: انڈونیشیا میں اسلامی سلطنتوں کے قیام نے معاشرتی اور تہذیبی زندگی کو کس طرح متاثر کیا؟

تعارف

انڈونیشیا دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی والا ملک ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ تجارت، تبلیغ اور صوفیائے کرام کی خاموش محنت سے پھیلا۔ تیرھویں صدی عیسوی سے عرب، گجراتی اور چینی مسلمان تاجروں کے ذریعے اسلام جزائرِ انڈونیشیا تک پہنچا اور پھر مقامی سلطنتوں کے قیام نے اسے ایک منظم معاشرتی و تہذیبی قوت بنا دیا۔ سمودرا پاسائی، آچے، دیماک، ماترم، بانتن، تیریتے اور تیدورے جیسی سلطنتوں نے نہ صرف سیاسی نقشہ بدلا بلکہ مقامی معاشرے کی اقدار، تعلیم، زبان، ادب، قانون اور رسم و رواج کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا۔

یہ سوال اسی اثرات کا جائزہ لینے کا مطالبہ کرتا ہے کہ اسلامی سلطنتوں کے قیام سے انڈونیشیا کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں۔ ذکر رہے کہ یہاں کی تبدیلی کسی بیرونی ثقافت کے جبّی مسلط ہونے کا نام نہیں تھی؛ اسلام مقامی سماج میں اس طرح رچ بس گیا کہ ایک نئی ملی انڈونیشی اسلامی تہذیب وجود میں آئی۔ ”نو اولیاء“ یعنی ولی سونگو کی حکمت عملی نے اس امتزاج میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ذیل میں ہم پہلے سلطنتوں کے قیام کا مختصر پس منظر بیان کریں گے اور پھر معاشرتی اور تہذیبی اثرات کا الگ الگ تجزیہ کریں گے۔

اسلامی سلطنتوں کا قیام: مختصر پس منظر

انڈونیشیا میں پہلی مسلم ریاست سماٹرا کے شمالی ساحل پر سمودرا پاسائی کی تھی، جو تیرھویں صدی کے آخر میں قائم ہوئی اور جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ پندرھویں صدی میں آبنائے ملاکا کی سلطنت نے خطے میں اسلام کے فروغ میں مرکزی کردار ادا کیا، کیونکہ ملاکا اس دور کی عظیم تجارتی بندرگاہ تھی جہاں سے اسلام جاوا، بورنیو اور مشرقی جزائر تک پھیلا۔ جاوا میں دیماک کی سلطنت پہلی بڑی مسلم طاقت بنی، جس نے ہندو مجاپاہت سلطنت کی جگہ لے لی۔ بعد میں ماترم کی سلطنت نے وسط جاوا میں، بانتن نے مغربی جاوا میں، آچے نے سماٹرا میں اور تیریتے و تیدورے نے مالوکو جزائر میں اسلامی حکومتوں کی بنیاد رکھی۔

ان سلطنتوں کے قیام میں صوفی داعیوں، خصوصاً جاوا کے ولی سونگو، کا کردار فیصلہ کن تھا۔ انہوں نے مقامی زبان، موسیقی، سایہ نائک (وایانگ) اور تہواروں کو دعوت کا ذریعہ بنایا اور اسلام کو مقامی تہذیب کے ساتھ اس قدر نرمی سے جوڑا کہ لوگ جوق در جوق اس میں داخل ہوئے۔ سلاطین نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں قائم کیں، علماء کو سرپرستی دی اور ملاکا و مکہ سے علمی روابط قائم کیے۔ اس طرح سلطنت کا قیام محض اقتدار کی تبدیلی نہیں تھا بلکہ ایک مکمل معاشرتی و تہذیبی انقلاب کا آغاز تھا، جس کے اثرات آج تک انڈونیشی معاشرے میں نمایاں ہیں۔

معاشرتی اثرات

معاشرتی زندگی پر سب سے گہرا اثر مساوات کے تصور کا پڑا۔ انڈونیشیا کا قدیم ہندوستانی اثر رکھنے والا معاشرہ ذات پات کے طبقاتی نظام میں جکڑا ہوا تھا، جہاں انسان کی قدر اس کے خاندان اور ذات سے طے ہوتی تھی۔ اسلام نے اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ مسجد میں بادشاہ اور عام آدمی ایک صف میں کھڑے ہونے لگے، جس نے سماجی درجہ بندی کی بنیادیں ہلا دیں۔ نچلے طبقات کے لیے یہ پیغام آزادی کا پیغام تھا، یہی وجہ ہے کہ عوامی سطح پر قبولِ اسلام تیزی سے آگے بڑھا اور معاشرے میں نسبتاً زیادہ برابری اور سماجی نقل و حرکت پیدا ہوئی۔

دوسرا اثر خاندانی اور اخلاقی زندگی پر پڑا۔ نکاح، طلاق، وراثت اور اولاد کی تربیت کے اسلامی اصولوں نے عورت کو وہ حقوق دیے جو اس سے پہلے اسے حاصل نہیں تھے؛ اسے وراثت میں حصہ، حق مہر اور شادی میں رضامندی کا حق ملا۔ شراب، جوئے اور بدکاری جیسی برائیوں کی حوصلہ شکنی نے سماجی اخلاقیات کو بلند کیا۔ سلام، مہمان نوازی، بزرگوں کا احترام اور رمضان و عیدین کی اجتماعی عبادات نے سماجی ربط کو مضبوط کیا۔ گاؤں کی سطح پر مسجد کمیونٹی کا مرکز بن گئی جہاں ملاقات، مشاورت اور فلاحی سرگرمیاں ہونے لگیں۔ نذرانہ وقف اور زکوٰۃ کے رواج نے معاشی امداد کا مقامی نظام پیدا کیا جس سے غریب اور مسکین طبقے کو سہارا ملا۔

تعلیمی و علمی اثرات

اسلامی سلطنتوں نے علم کے فروغ کو اپنی ذمہ داری سمجھا اور اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ مساجد سے ملحق "پیسانترین" یعنی دینی مدارس کا نظام وجود میں آیا، جہاں قرآن، فقہ، عربی زبان اور اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ پیسانترین آج بھی انڈونیشیا کے تعلیمی نظام کا اہم ستون ہیں اور لاکھوں طلبہ ان میں دینی و عصری تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ سلطنتوں نے مکہ مکرمہ، قاہرہ اور یمن سے علماء کو بلایا اور اپنے طلبہ کو حصولِ علم کے لیے حرمین بھیجا، جس سے انڈونیشیا کا علمی تعلق پورے عالمِ اسلام سے جڑ گیا اور یہاں عربی و فارسی کتب کا ترجمہ و تشریح کا سلسلہ شروع ہوا۔

زبان و ادب پر بھی یہ اثر گہرا تھا۔ ملایو زبان، جو تجارت کی زبان تھی، اسلام کی زبان بن گئی اور عربی رسم الخط میں "جاوی" تحریر کا رواج ہوا۔ آچے کے علماء، مثلاً حمزہ فنصوری اور نورالدین الرانیری، نے ملایو میں تصوف و فقہ کی کلاسیکی تصانیف لکھیں، جن سے ملایو ادب کی بنیاد پڑی۔ سلطنتوں کے درباروں میں داستان، نظم اور حکایت کی نئی اصناف پروان چڑھیں اور مقامی زبانوں میں اسلامی اخلاقیات اور تاریخ پر وسیع لٹریچر تیار ہوا۔ یوں اسلام نے انڈونیشیا کو نہ صرف ایک مذہب دیا بلکہ تحریر، علم اور ادب کی ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا، جس کا مرکز خطے کا اپنا شہر و گاؤں تھا۔

تہذیبی اثرات: فن، قانون اور مقامی امتزاج

تہذیبی میدان میں فنِ تعمیر سب سے نمایاں مثال ہے۔ انڈونیشیا کی ابتدائی مساجد کی تعمیر میں مقامی جاوی طرز برقرار رکھا گیا؛ کثیر المنزلہ چھتیں اور مینار نما ڈھانچے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اسلام نے مقامی فن کو ختم کرنے کے بجائے اسے نیا مفہوم دیا۔ مسجد دیماک اور مسجد قدس اس امتزاج کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اسی طرح خطاطی، باٹک کے نقش و نگار اور پھول پتوں کی تزئین میں اسلامی ذوق جھلکنے لگا، جبکہ انسانی تصویروں کی جگہ جیومیٹری اور خطاطی نے لے لی۔ موسیقی میں گیملان کے ساتھ شولاوت (درود و نعت) کی محفلیں رائج ہوئیں اور وایانگ نائک میں اسلامی قصے شامل ہو گئے۔

قانونی زندگی میں شریعت کے احکام نے سماجی ڈھانچے کو نیا رخ دیا۔ سلطنتوں نے قاضی مقرر کیے، شادی بیاہ، وراثت اور کاروباری تنازعات شرعی اصولوں کے مطابق طے ہونے لگے، اگرچہ مقامی "عادت" قانون بھی ساتھ چلتا رہا۔ اسی سے "الادۃ محکمۃ" جیسے فقہی اصول کو عملی شکل ملی کہ شریعت اور عرف میں توازن قائم رہے۔ بعد میں ڈچ استعمار نے اسلامی قانون کو محدود کرنے کی کوشش کی، مگر عوامی زندگی میں اس کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ آج بھی انڈونیشیا میں نکاح و وراثت کے معاملات بڑی حد تک اسلامی اصولوں کے مطابق طے ہوتے ہیں اور آچے میں شرعی نظام کی خاص صورت برقرار ہے۔ یہ سب انہی سلطنتوں کے قائم کردہ ڈھانچے کی دین ہے۔

سیاسی و مزاحمتی کردار

اسلامی سلطنتوں کا ایک اور اہم اثر سیاسی شعور کی بیداری تھی۔ جب سولھویں صدی میں پرتگالی اور پھر ڈچ استعمار نے جزائر پر قبضے کی کوشش کی تو مزاحمت کا پرچم انہی سلطنتوں اور علماء نے اٹھایا۔ آچے کی سلطنت نے عشروں تک پرتگالیوں اور ڈچوں کا مقابلہ کیا، جاوا کے شہزادے دیپونگورو کی جنگ (1825ء–1830ء) کو جہاد کا رنگ حاصل تھا اور سماٹرا میں امام بونجول کی پیڈری تحریک نے اصلاح و مزاحمت کو جوڑ دیا۔ اس مزاحمتی روایت نے اسلام کو انڈونیشیا میں قومی شناخت کا حصہ بنا دیا؛ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی تحریکِ آزادی میں مسلم تنظیمیں اور علماء سب سے آگے تھے۔

آزادی کے بعد یہی تہذیبی ورثہ انڈونیشیا کی قومی سیاست کی بنیاد بنا۔ اس ملک نے اسلامی شناخت کے ساتھ جمہوریت اور مذہبی رواداری کو جوڑنے کا تجربہ کیا، جس میں قدیم سلطنتوں کے دور سے موجود اعتدال اور ہم آہنگی کی روایت نے مدد دی۔ آج بھی انڈونیشیا کی عوامی زندگی میں نماز، روزہ، حج اور مدارس کا نظام اس قدر مضبوط ہے کہ یہ خطہ دنیا کے سامنے پرامن، اعتدال پسند اور تہذیبی طور پر بھرپور اسلام کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہ پورا تسلسل انہی اسلامی سلطنتوں کی عطا ہے جنہوں نے چھ سو سال پہلے اس سرزمین پر دین کی بنیادیں رکھیں۔

نتیجہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انڈونیشیا میں اسلامی سلطنتوں کے قیام نے معاشرے کو ہر سطح پر بدل کر رکھ دیا۔ سماجی طور پر ذات پات کی جگہ مساوات آئی، عورت کو حقوق ملے، خاندانی نظام مضبوط ہوا اور فلاح کا مقامی ڈھانچہ قائم ہوا۔ تعلیمی و تربیتی طور پر پیسانترین مدارس، ملایو جاوی ادب، اسلامی خطاطی و فنِ تعمیر اور شرعی قانون نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو مقامی رنگ کے ساتھ اسلامی بھی تھی۔ سیاسی طور پر انہی سلطنتوں نے استعمار کے خلاف مزاحمت کی روایت قائم کی جو آزادی کی جدوجہد تک جاری رہی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تبدیلی جنگ و جدل سے نہیں، تدریج، حکمت اور مقامی ثقافت کے احترام سے آئی، اور یہی اس کے دیرپا ہونے کا سبب ہے۔ انڈونیشیا کی مثال اس اصول کو ثابت کرتی ہے کہ اسلام جب دعوت اور کردار کے ساتھ پھیلتا ہے تو معاشرے محض مذہب نہیں بدلتے، پوری تہذیب سنور جاتی ہے۔

سوال نمبر 5 (20 نمبر)

سوال نمبر 5: ایرانی معاشرے میں مغربی تہذیب کے غلبے کے سماجی اور اخلاقی اثرات کا تجزیہ کریں۔

تعارف

ایران ان مسلم ممالک میں شامل ہے جہاں مغربی تہذیب کا غلبہ سب سے منظم اور جبری انداز میں مسلط کیا گیا۔ انیسویں صدی میں قاجار خاندان کے دور سے یورپی اثرات کا آغاز ہوا، مگر اس کا اصل دور پہلوی خاندان (1925ء–1979ء) تھا۔ رضا شاہ پہلوی نے ترکی کے مصطفیٰ کمال سے متاثر ہو کر ایران کو مغربی طرز پر جدید بنانے کا پروگرام شروع کیا اور اس کے بیٹے محمد رضا شاہ نے 1963ء کے "سفید انقلاب" اور امریکہ سے گہرے تعلقات کے ذریعے اس عمل کو انتہا تک پہنچا دیا۔ مغربی لباس، تعلیم، میڈیا، معیشت اور طرزِ زندگی اوپر سے نیچے تک نافذ کی گئی اور مذہب و مقامی اقدار کو پسماندگی کی علامت قرار دیا گیا۔

اس سوال میں ہمیں اس غلبے کے سماجی اور اخلاقی اثرات کا تجزیہ کرنا ہے۔ یہ تجزیہ یک طرفہ نہیں ہونا چاہیے؛ مغربی جدیدیت کے کچھ ثمرات، مثلاً جدید تعلیم، صحت کی سہولتیں اور خواتین کی تعلیم، ظاہراً مثبت تھے۔ لیکن چونکہ یہ تبدیلی عوام کی مرضی اور ثقافتی مزاج کے خلاف طاقت کے زور سے مسلط کی گئی، اس کے سماجی و اخلاقی نتائج بڑی حد تک تباہ کن نکلے: خاندانی نظام کمزور ہوا، اخلاقی بے راہ روی پھیلی، معاشرہ دو طبقوں میں بٹ گیا اور مذہب سے ٹکراؤ نے بالآخر 1979ء کے انقلاب کی راہ ہموار کر دی۔ ذیل میں ان اثرات کا منظم جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

پس منظر: مغربی غلبے کی صورت اور ذرائع

ایران میں مغربی غلبے کے ذرائع کئی تھے۔ سیاسی سطح پر برطانیہ، روس اور پھر امریکہ کا اثر و رسوخ ایران کی سیاست پر حاوی رہا؛ 1953ء میں منتخب وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کی حکومت کا خاتمہ غیر ملکی مداخلت کی سب سے واضح مثال ہے، جس نے عوام میں مغرب کے خلاف نفرت کی گہری بنیاد رکھی۔ معاشی سطح پر تیل کی آمدنی مغربی کمپنیوں کے ہاتھ میں رہی اور ملکی معیشت کو صارفیت اور درآمدات پر منحصر بنا دیا گیا۔ ثقافتی سطح پر امریکی و یورپی فلموں، رسائل، شراب خانوں، جوا خانوں اور مخلوط تفریحی مقامات نے شہروں کی صورت بدل دی۔ تعلیمی سطح پر نصاب کو مغربی خطوط پر ڈھالا گیا اور فارسی تاریخ و اسلامی ورثے کو پس پشت ڈال دیا گیا۔

ریاست نے اس عمل میں زبردستی کا کردار ادا کیا۔ 1936ء میں رضا شاہ نے "کشفِ حجاب" کے حکم سے خواتین کے پردے پر پابندی لگا دی اور پولیس سڑکوں پر خواتین کی چادریں اتروانے لگی۔ مردوں کے لیے یورپی ٹوپی اور لباس لازمی قرار دیا گیا، علما کے مذہبی لباس پر پابندیاں لگیں اور مذہبی اجتماعات محدود کر دیے گئے۔ گاؤں اور قبائل کو زبردستی بے دخل کر کے بٹھایا گیا، جس سے ان کی سماجی ساخت ٹوٹی۔ طاقت کے زور پر تہذیب بدلنے کی یہ کوشش درحقیقت سماج کی جڑوں کو کاٹنے کے مترادف تھی، کیونکہ کوئی بھی تبدیلی جب عوام کی اقدار کے حساب سے نہیں آتی تو وہ قبولیت کے بجائے ردعمل پیدا کرتی ہے۔

سماجی اثرات

سماجی میدان میں سب سے نمایاں اثر خاندان کے ادارے کی کمزوری تھا۔ ایرانی معاشرہ روایتی طور پر مضبوط خاندانی رشتوں، بزرگوں کے احترام اور مشترکہ رہن سہن پر قائم تھا۔ مغربی فردیت پسندی، شہری زندگی کی مشغولیت اور میڈیا کے فروغ نے فرد کو خاندان سے کاٹ کر خود مختار اکائی بنا دیا۔ شہروں میں طلاق کی شرح بڑھی، شادی کی عمر میں غیر معمولی تاخیر ہونے لگی اور بزرگوں کی دیکھ بھال کا روایتی نظام کمزور پڑ گیا۔ یہ ہجرتوں سے شہروں کی طرف بڑی ہجرت نے گاؤں کی سماجی زندگی کو ویران اور شہروں میں کچی آبادیوں کے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ تہران ایک ایسا شہر بن گیا جس کے ایک سرے پر یورپی طرز کی عشرت آباد اور دوسرے سرے پر غربت کے ڈھیر تھے۔

دوسرا سماجی اثر معاشرے کی دوئی تھی۔ مغرب زدہ اشرافیہ اور دین دار عوام کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی جو وقت کے ساتھ نفرت میں بدلتی گئی۔ سرکاری طبقہ فرانسیسی یا انگریزی طرزِ زندگی کو فخر سمجھتا تھا جبکہ عام آدمی اسے اپنی توہین محسوس کرتا تھا۔ خواتین کے معاملے میں بھی معاشرہ منقسم ہوا: ایک طرف تعلیم و ملازمت کے مواقع بڑھے، دوسری طرف پردے پر جبری پابندی نے دین دار گھرانوں کی بیٹیوں کو تعلیم اور باہر نکلنے سے محروم کر دیا، کیونکہ وہ بے پردہ ہو کر گھر سے نکلنا قبول نہیں کرتی تھیں۔ یوں جو اقدام عورت کی آزادی کے نام پر اٹھایا گیا، اس نے ایک بڑے طبقے کی عورت کو مزید گھر میں قید کر دیا۔ یہ سماجی انتشار دراصل جبری مغربیت کا سب سے نقصان دہ نتیجہ تھا۔

اخلاقی اثرات

اخلاقی میدان میں اثرات اور بھی واضح تھے۔ مغربی تفریحی صنعت کے ساتھ شراب نوشی، جوئے، رقص و موسیقی کی مخلوط محافل اور نیم عریاں فیشن عام ہوا۔ سینما اور بعد میں ٹیلی وژن نے مغربی طرز کے رومانوی اور پُر تشدد مواد کو نوجوانوں کے سامنے رکھا، جس سے حیاء، عفت اور خاندانی تقدس کے مقامی تصورات متزلزل ہوئے۔ تہران اور بڑے شہروں میں بدکاری کے اڈے کھل گئے اور اخلاقی جرائم میں اضافہ ہوا۔ مصرفیت اور دولت کی نمائش نے سادگی اور قناعت کی جگہ نمود و نمائش، رشوت اور کرپشن کو فروغ دیا؛ تیل کی دولت کے گرد ایک ایسا نظام بنا جس میں دولت کمانا ہی زندگی کا مقصد بن گیا۔

ان اثرات پر قانونی چھتری بھی موجود تھی۔ خاندانی قوانین میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں جن سے شریعت کے کئی احکامات معطل ہوئے، اوقاف کی زمینیں اصلاحات اراضی کے نام پر ضبط کی گئیں اور مذہبی اداروں کی معاشی خودمختاری ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ساواک جیسی خفیہ پولیس نے ہر مخالف آواز کو کچلنا شروع کر دیا، جس سے سماج میں خوف اور بے اعتمادی کی فضا بنی۔ اخلاقی بے راہ روی کے ساتھ سیاسی جبر کا امتزاج عوام کے ذہن میں ایک ہی تصویر بناتا گیا کہ یہ نظام ان کی اقدار اور آزادی دونوں کا دشمن ہے۔ یہی ذہنی پس منظر بعد میں مذہبی قیادت کی اپیل کو عوامی قوت میں بدلنے کا سبب بنا۔

ردعمل: مذہبی بیداری اور انقلاب کی بنیادیں

ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ مغربی غلبے کے خلاف ایران میں آہستہ آہستہ ایک فکری و عوامی ردعمل تشکیل پایا۔ ڈاکٹر علی شریعتی جیسے مفکرین نے نوجوانوں کو "اپنی اصل کی طرف واپسی" کا پیغام دیا اور مغرب زدگی کو "غرب زدگی" کے نام سے ایک بیماری قرار دیا؛ جلال آلِ احمد کی مشہور کتاب "غرب زدگی" اسی دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ علما، خصوصاً امام خمینی، نے 1963ء سے شاہ کی پالیسیوں کے خلاف کھل کر آواز اٹھائی اور انہیں اسلام اور ملکی آزادی کے خلاف قرار دیا۔ مساجد اور مذہبی اجتماعات وہ مراکز بن گئے جہاں ناراض عوام کو تنظیم اور قیادت میسر آئی۔

یہ ردعمل بتاتا ہے کہ مغربی غلبے کے سماجی و اخلاقی اثرات محض ثقافتی بحث نہیں رہے بلکہ سیاسی طاقت میں تبدیل ہو گئے۔ جب 1978ء میں احتجاجی لہر اٹھی تو اس کی صفوں میں وہ تمام طبقات شامل تھے جو جبری مغربیت سے تنگ آ چکے تھے: دین دار تاجر، علما، طلبہ، مزدور اور متوسط طبقہ۔ 1979ء کا انقلاب اسی نصف صدی کے سماجی و اخلاقی بیگانگی کا بالآخر پھٹنے والا لاوا تھا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ تہذیبی تبدیلی اگر عوام کی شناخت اور اقدار کو مٹا کر لائی جائے تو وہ ترقی کے بجائے بحران پیدا کرتی ہے، اور جلد یا بدیر معاشرہ اپنی بنیادوں کی طرف پلٹتا ہے۔

متوازن تجزیہ

انصاف کا تقاضا ہے کہ تجزیہ متوازن ہو۔ پہلوی دور میں جدید اسکول، یونیورسٹیاں، ریلوے، اسپتال اور انتظامی ڈھانچہ بھی قائم ہوا اور خواتین کی تعلیم کا دائرہ وسیع ہوا۔ مسئلہ جدید سہولتوں کا نہیں تھا، مسئلہ اس ذہنیت کا تھا جو ہر مغربی چیز کو ترقی اور ہر مقامی و اسلامی چیز کو پسماندگی سمجھتی تھی۔ اگر یہ سہولتیں قوم کی تہذیبی اساس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر آتیں تو شاید ان کا خیر مقدم ہوتا۔ ترکی اور ایران کے تجربات نے اسلامی تحریکوں نے یہ اصول اخذ کیا کہ جدید علم و ٹیکنالوجی کو اپنانا اور مغربی تہذیب کی ذہنی غلامی اختیار کرنا دو الگ چیزیں ہیں؛ پہلی پسندیدہ ہے، دوسری تباہ کن۔

ایران کی مثال آج کے ہر مسلم معاشرے کے لیے آئینہ ہے۔ عالمی میڈیا، تعلیمی ادارے اور معاشی نظام آج بھی اسی دباؤ کو نئی صورتوں میں پیش کر رہے ہیں۔ خاندان کا تحفظ، نوجوانوں کی اخلاقی تربیت، اپنی زبان و تاریخ سے جڑت اور میڈیا کا باشعور استعمال ہی وہ تدابیر ہیں جن سے کوئی معاشرہ جدید سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی اپنی اخلاقی شناخت برقرار رکھ سکتا ہے۔ ایرانی تجربہ ثابت کرتا ہے کہ قومیں اپنی اقدار کھو کر وقتی چمک تو حاصل کر سکتی ہیں، پائیدار وقار نہیں۔

نتیجہ

مجموعی طور پر ایرانی معاشرے میں مغربی تہذیب کے غلبے کے سماجی اثرات میں خاندانی نظام کی کمزوری، معاشرتی تقسیم، دیہی زندگی کا زوال اور شہری مسائل کا اضافہ نمایاں ہے، جبکہ اخلاقی اثرات میں حیاء و عفت کے تصورات کا متزلزل ہونا، شراب و بدکاری کا فروغ، مصرفیت، کرپشن اور اقدار کی جگہ مادیت کا آجانا سب سے سنگین ہیں۔ یہ غلبہ اس لیے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا کہ یہ تدریجی اور رضاکارانہ نہیں بلکہ ریاستی جبر کے ذریعے مسلط کیا گیا تھا۔ نتیجتاً معاشرہ اپنی ہی ریاست سے بیگانہ ہو گیا اور وہ بیگانگی 1979ء کے انقلاب کی صورت میں سامنے آئی۔ اس تجزیے کا حاصل یہ ہے کہ تہذیبیں درآمد نہیں کی جاتیں؛ جو معاشرہ اپنی فکری و اخلاقی بنیادوں پر جدید زندگی تعمیر کرتا ہے وہی ترقی کو پائیدار بنا سکتا ہے، ورنہ غلبۂ غیر کا انجام ردعمل اور انتشار ہی ہوتا ہے۔